اقبال کے اصولِ خودی اور ان کا اطلاق

مسز شگفتہ شہناز

یوں تو علامہ اقبال کا تمام فلسفہ اور کلام سراسر عملی اور ادب برائے مقصد کی خوبصورت تصویر ہے لیکن ان کی مثنویاں (اسرار و رموز) تو خاص طور پر افراد و اقوام کو ایک ایسا لائحہ عمل مہیا کرتی ہیں جن پر بتدریج عمل کر کے افراد و اقوام عروج کے افق کو چھو سکتے ہیں اور ہر مسلمان اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ہر مسلم ریاست ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی عظمت رفتہ کو پا سکتی ہے۔

مثنوی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں بیان کردہ ان کے نظریات اور فلاسفی دراصل علامہ اقبال کے افکار میں مرکزی نکتہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس فلسفے کی تشکیل کے بعد ان کی تمام عمر اسی فلسفے کی علمی اور عملی توضیح و تشریح میں گزری۔ ان کے فلسفہ خودی کے عملی ہونے کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس فلسفے کا یہ اثر تو انھوں نے اپنی زندگی میں ہی دیکھ لیا تھا کہ اس کے باعث برصغیر کے مسلمانوں میں ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا اور وہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنے تشخص کے لیے پوری طرح روبہ عمل ہو گئے تھے۔ برصغیر سے باہر عام اسلامی دنیا میں بھی ان کے اس فلسفے کے اثرات پہنچ گئے۔ ملت اسلامیہ نے اس سے اثر قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔

مثنوی اسرارِ خودی کی تصنیف کے محرکات میں بھی یقیناً ملت اسلامیہ کی بقا اور استحکام کا جذبہ تھا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی لکھتے ہیں:

> قیام یورپ کے زمانے میں جب انھوں نے فلسفۂ عجم پر اپنا علمی مقالہ لکھا اور اس ضمن میں فارسی ادب اور تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ دنیا میں مسلمانوں کی کمزوری اور انحطاط کا ایک بڑا سبب عجمی تصوف اور نفی خودی کا وہ تصور ہے جو انسانی وجود کو موہوم سمجھتا ہے یا بس قنوطیت کی تعلیم دیتا ہے اور سعی و عمل کی بجائے یہ سکھاتا ہے کہ دوڑنے سے لے کر چلنے، کھڑا رہنے، بیٹھنے، سونے اور مرنے تک سکون کی ہر منزل میں زیادہ راحت ہوتی ہے۔

............اقبال کو یقین تھا کہ اس شدید کش مکش حیات کے زمانے میں مسلمان اگر اسی تصورِ حیات کو لیے رہیں اور اپنی انفرادی و اجتماعی قدر و قیمت نہ جانیں تو ان کا جو حشر ہونے والا ہے اس کی پیش قیاسی بلقان اور طرابلس کی جنگوں سے ہو سکتی ہے۔[1]

علامہ اقبال وقتاً فوقتاً اپنی اردو نظموں کے ذریعے ملت اسلامیہ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے رہے۔ اس کا بہترین ثبوت ان کی نظم ''شمع اور شاعر'' ہے جو ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے[2]

شاید علامہ اقبال نے یہ محسوس کیا کہ نظمیں اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہیں، بلکہ اس کے لیے کوئی تفصیلی کتاب لکھنی چاہیے جس میں فلسفہ خودی اور تصور حیات کی تشریح دل آویز پیرائے میں ہو سکے۔ جو مسلمانانِ عالم کے لیے ایک مکمل لائحہ عمل کا کام دے۔ اس کے لیے انھیں ناگزیر طور پر اردو کو چھوڑ کر فارسی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ ایک تو کم عمر اردو زبان کی تنگ دامنی مدنظر تھی تو دوسری طرف وہ یہ پیغام خودی صرف برصغیر کے مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے فارسی زبان ہی زیادہ موزوں تھی۔

مثنوی اسرارِ خودی اس مشہور عربی مقولے کی تفسیر و تشریح ہے: من عرف نفسه فقد عرف ربه۔ ان کے خیال میں نظام عالم کی بنیاد ''خودی'' پر ہے اور جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ صرف خودی کا کھیل ہے۔ انفرادی زندگی کا تسلسل خودی کو مستحکم کرنے سے ہے اور زندگی کا باقی رہنا تخلیق اور تولید مقاصد کی بنا پر ہے۔ عشق الٰہی اور محبت رسول ﷺ سے خودی مضبوط و مستحکم ہوتی ہے۔ اغیار سے سوال کرنے یا ان کے دست نگر اور محتاج ہونے سے خودی کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہے۔ اس لیے خوددار انسان کو کسی کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔

علامہ اقبال کے نزدیک زندگی کا ثبوت ہی یہ ہے کہ ہم اپنی دنیا خود پیدا کریں۔ فطرت اور ماحول سے ہم کو جو کچھ ملتا ہے اس پر قانع اور مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ اپنے لیے ایک نئی دنیا تخلیق کریں:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے[۳]

علامہ اقبال کے خیال میں نفیِ خودی کا اصول مغلوب اور مفتوح قوموں کا ایجاد کیا ہوا ہے۔ یہ مفتوح و مغلوب قومیں چاہتی ہیں کہ وہ غالب اور فاتح قوموں کو کمزور کر دیں تا کہ ان کے ظلم و ستم سے نجات پائیں اس لیے وہ بے خودی اور فنائیت کے مسلک کا پرچار کرتی ہیں۔ اس دلیل کو وہ ایک مثال بلکہ ایک حکایت سے بیان کرتے ہوئے ''بکریوں'' کے ایک گروہ کا ذکر کرتے ہیں جو شیروں کے ظلم و ستم سے قطعی بے بس اور تنگ آ کر ایک زیرک ''بھیڑ'' سے اس مسئلے کا حل چاہتا ہے۔ دانا اور زیرک بھیڑ کئی ہفتوں کی سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ بکریوں کی بزدل اور بے حوصلہ جماعت میں تو شیروں کی خو بو پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ شیروں میں بزدلی اور بے حوصلگی پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس کا ذہن رسا تھا اور یوں بھی غلامی اور محکومی میں جب جذبہ انتقام پختہ ہو جائے تو عقل حیلہ گری اور فتنہ انگیزی میں تیز ہو جاتی ہے لہٰذا اس نے ایک مکمل منصوبہ تیار کیا۔ کچھ عرصے کے بعد اس بھیڑ نے اعلان کر دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیروں کے لیے پیغمبر مقرر ہو کر آئی ہے اور ایسا آئینِ حیات لائی ہے جس سے بے نور آنکھوں کو نور اور محروم مسرت دلوں کو مسرت میسر آئے گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے طاقت کے حصول اور استعمال کے خلاف اپنے تصورات کی اشاعت موثر انداز میں شروع کر دی اور شیروں کو آمادہ کر لیا کہ وہ خون خواری اور گوشت خوری سے باز آ جائیں۔ شیروں پر عجز و انکسار پر مبنی نفیِ خودی کی خواب آور تعلیم کا گہرا اثر ہوا۔ وہ تن آسان اور آرام طلب ہو کر گھاس پات پر گزران کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی آنکھوں سے ہیبت و جلال کی روشنی ختم ہو گئی، ان کے آہنی پنجے بے زور ہو گئے، ان کے دل افسردہ اور بدن ہڈیوں کے پنجر نظر آنے لگے۔ الغرض ایک انتقام پسند بھیڑ کی حیلہ گری اور فسوں کاری سے جیتے جاگتے شیر بھیڑوں کا گلہ بن کر رہ گئے۔

پروفیسر محمد عثمان اس حکایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس حکایت کا موضوع اقبال کے نظامِ فکر میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نطشے اور بعض دوسرے مغربی مفکرین کی طرح وہ بھی ہر اس تحریک اور فلسفہ کے جانی دشمن ہیں جو انسانوں کے قوائے عمل کو مضمحل اور ان کے ارادوں کو کمزور اور بے جان بنا دے۔......اقبال کے نزدیک وہ تصورات جو دنیا کو موہوم اور دنیوی جدوجہد کو بے سود ٹھہراتے ہیں اور جن کی بدولت انسانوں میں مسکینی و دل گیری پیدا ہوتی ہے، خودی کے لیے انتہائی زہرناک ہیں۔[۴]

علامہ اقبال نفیِ خودی اور فنا کی اس تعلیم کو ''مسلک گوسفندی'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مسلک افلاطون کا پیش کردہ ہے چونکہ افلاطون کا اثر مسلم صوفیہ اور مفکرین پر خاصا زیادہ تھا اس

لیے مسلمان بھی اس مسلک گوسفندی کے پیروکار ہو گئے اور اپنی کمزوری اور انحطاط کو تہذیب کی علامت سمجھنے لگے۔ پھر وہ شعر کی حقیقت بیان کر کے اسلامی ادبیات کی اصلاح چاہتے ہیں اور ادب وفن کو عجمیت اور بے عملی سے خودی اور زندگی کی طرف واپس لانا چاہتے ہیں۔ وہ خودی کے تربیتی لائحہ عمل پر وضاحت سے روشنی ڈالتے ہوئے اس کے تین مرحلے متعین کرتے ہیں۔ پہلا مرحلہ ''اطاعت'' ہے، کیونکہ اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اعلیٰ اور حقیقی حریت اطاعت الٰہی یعنی پابندی فرائض ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ بقول عزیز احمد:

> اطاعت کے معنی ہیں اپنے فرائض سے سرتابی نہ کرنا، جبر سے اختیار پیدا ہوتا ہے، مہ و پروین کی تسخیر سے پہلے اپنے آپ کو کسی نہ کسی آئین کا پابند بنانا ضروری ہے۔[۵]

تربیت خودی کے لیے دوسرا مرحلہ ''ضبطِ نفس'' کا ہے یعنی اپنے نفس پر قابو حاصل کرنے کا۔ کیونکہ جس شخص کا حکم اپنی ذات پر نہیں چلتا وہ لازماً دوسروں کا محکوم ہو جاتا ہے۔ ملک حسن اختر اس پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> اقبال کے نزدیک اپنے نفس کو قابو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوف دنیا، خوف عقبیٰ، خوف جان اور خوف آلام زمین سے نجات حاصل کرے۔ اس طرح اسے بعض چیزوں کی محبت سے بھی احتراز کرنا چاہیے مثلاً حب مال و دولت، حب وطن، حب خویش واقربا، حب زن، یہ محبتیں انسان سے ایسے کام کرواتی ہیں جو خودی کے لیے مضر ہیں۔ ان محبتوں اور خوف سے بچنے کے لیے۔ ۱: لاالٰہ کی تلوار ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ ۲: نماز سے اپنے دل کو قوی کر لیا جائے۔ ۳: روزہ کی مدد سے تن پروری سے نجات حاصل کر لی جائے۔ ۴: حج سے وطن پرستی ختم کی جائے اور ہجرت کا سبق سیکھا جائے۔ ۵: حب دولت کو زکوٰۃ سے ختم کیا جائے۔ یہ پانچ چیزیں انسان کے نفس کو قابو میں کرتی ہیں اور وہ نفس کے اونٹ پر سواری کے قابل بن جاتا ہے۔...... وہ خدا کا نائب کہلاتا ہے اس کی خودی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ عناصر پر اس کی حکمرانی ہوتی ہے۔ وہ کائنات کی روح ہوتا ہے۔ اور اس کی ہستی اسم اعظم کی طرح مشکل کشا ہو جاتی ہے۔[۶]

تربیت خودی کا تیسرا مرحلہ ''نیابت الٰہی'' کا ہے۔ اس مرحلے پر من وتو کے فاصلے سمٹ جاتے ہیں اللہ کا ہاتھ بندۂ مومن کا ہاتھ بن جاتا ہے، مختصر یہ کہ علامہ اقبال اس مثنوی اسرارِ خودی کے ذریعے مسلمانوں میں احساس بیداری پیدا کر کے انھیں عمل پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ شکست خوردہ، تنزل وپستی، ذلت ونکبت اور احساس کمتری میں گرفتار مسلمانوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگرچہ تخت وتاج آج مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور وہ اغیار کی نگاہوں میں زیاں کار اور ذلیل وخوار ہیں لیکن وہ اب بھی توحید کے علم بردار اور رحمتِ کونین ﷺ کے محافظ ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر کی نظروں میں وہ سر مکنون ہیں اور دنیا کی خلافت انھی کے لیے ہے۔ چاند اور سورج انھی کے نور سے روشن ہیں کیونکہ ان کی ذات، ذات حق کا مظہر ہے ان کی ہستی خدا کی نشانی ہونے کے باعث کبھی فنا پذیر نہیں ہو سکتی۔

پروفیسر محمد قاسم بن حسن اس مثنوی کے فلسفے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زندگی ایک بدیہی قوت ہے اس کا سرچشمہ یہ ہے کہ غلبہ پانے اور برتر ہونے کا ذوق ہو۔ یعنی جب تک دل میں بڑے کارنامے انجام دینے اور ہر مشکل سے پنجہ آزما ہونے کی تڑپ موجود نہ ہو، قوت کہاں سے آئے گی؟ جو فرد ذلت کی گہرائی میں پڑا ہوتا ہے وہ اپنی کمزوری و ناتوانی کو صبر و قناعت کا نام دیتا ہے۔ حالانکہ کمزوری اور ناتوانی زندگی کے راستے کے قزاق اور راہزن ہیں۔ ان کے بطن سے ڈر اور جھوٹ پیدا ہوتے ہیں۔[۷]

مطلب یہ کہ جو وجود کمزور ہوگا وہ سب سے ڈرے گا۔ جب اسے کوئی نازک موقع پیش آئے گا تو جھوٹ بول کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ بقول علامہ اقبال:

زندگانی قوت پیدا ستے
اصل او ذوق استیلا ستے
ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است[۸]

الغرض علامہ اقبال مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ جو بارِ امانت (خلافتِ الٰہی) تو نے اٹھا رکھا ہے اسے منزل تک پہنچانے کے لیے جو قاعدے اور ضابطے ہیں تو ان سے بے خبر نہ ہو جا، بلکہ اس کے لیے صحیح صلاحیت پیدا کر اور یہ صلاحیت اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ تو اپنی ذات کو دونوں جہانوں سے بہتر سمجھے اور ماسوا سے ماورا ہو کر اپنے آپ کو صرف خدائے لم یزل کے کاموں کے لیے وقف کر دے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ''خودی کا کردار'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں:

وجود اور تخلیق کے مسلسل عمل کو بڑھانے میں خودی کا جو حصہ ہے وہ یہ ہے کہ خودی کی غایت نہائی یہ نہیں کہ وہ کوئی چیز دیکھے بلکہ یہ ہے کہ وہ کچھ بن جائے۔ خودی کی کچھ بن جانے کی یہ کوشش ہی انسان کو اس قابل بناتی ہے کو وہ معروضیت کو صیقل کرنے کا آخری موقع حاصل کر لے اور اس طریقے سے............ بنیادی حقیقت ''میں ہوں'' کو حاصل کر لے۔ وہ اپنی حقیقت کا ثبوت ڈیکارٹ کے ''میں سوچتا ہوں'' میں نہیں بلکہ کانٹ کے ''میں کر سکتا ہوں'' میں تلاش کر لے............ دنیا نہ تو محض دیکھنے کی چیز ہے اور نہ تصورات کے ذریعے سے ماننے کی، بلکہ ایسی شے ہے جسے تخلیق اور تخلیق نو کے مسلسل عمل سے گزرنا ہے۔[۹]

خودی کی کاملیت یہ ہے کہ مردِ مومن خدائے لم یزل کا دستِ قدرت اور زبان بن جاتا ہے۔ اس کی تدبیر ہی اس کی تقدیر بن جاتی ہے وہ لوح و قلم کا مالک بن جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ انسان تنہائی کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہ لازماً کسی معاشرے، کسی قوم و ملت کا فرد ہوتا ہے اور یقیناً فرد اور ملت کے درمیان رابطے اور تعلقات کے کچھ اصول و

قوانین ہوتے ہیں۔ فرد و ملت کے اس رشتے اور تعلق کو علامہ اقبال نے اپنی دوسری مثنوی رموزِ بے خودی میں بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس مثنوی میں فرد و ملت کے رابطے کو واضح کرنے کے لیے تصوف کی مشہور اصطلاح قطرہ و دریا استعمال کی ہے۔ بقول پروفیسر محمد جلیل نقوی:

اردو و فارسی کے صوفی شعرا نفس انسانی کو قطرے سے اور ذات ایزی (اللہ تعالیٰ) کو دریا سے تشبیہ دیتے آئے ہیں ان کا عقیدہ رہا ہے کہ ''عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ہے'' لیکن علامہ اقبال اس تمثیل کو فرد و ملت کے درمیان رابطے و تعلق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔[10]

ان کے خیال میں قطرہ (فرد) دریا (ملت) میں مل جانے سے فنا نہیں ہو جاتا بلکہ مزید مستحکم ہو جاتا ہے اپنی ذات میں اور اس طرح قطرہ (فرد) بلند اور دائمی مقاصد سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اور اس کی خودی لازوال اور پائیدار ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال اپنی ایک اور نظم میں افراد و ملت کے تعلق کو ایک درخت کی طرح قرار دیتے ہیں۔ ملت درخت کا ایک تنا ہے تو افراد اس درخت کی شاخیں۔ ان کے خیال میں اگر شاخ درخت سے ٹوٹ کر الگ ہو جائے تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ درخت سے وابستہ رہے تو خزاں کے بعد اس پر بہار کا موسم بھی آتا ہے اور اس کا خالی وجود برگ و بار سے سج جاتا ہے۔ فرماتے ہیں:

ڈالی گئی جو فصل خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحاب بہار سے
ہے لازوال عہد خزاں اس کے واسطے
کچھ واسطہ نہیں اسے برگ و بار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ[11]

ایک اور جگہ فرد و ملت کے رشتے کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں[12]

فرد اور معاشرے کے تعاون اور ملاپ ہی سے تمدن کی تخلیق ہوتی ہے۔ معاشرتی اور تمدنی پابندیاں اور ذمہ داریاں ہی ایک فرد کو کمال ذات کی طرف لے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین رقم طراز ہیں:

پابندیاں ہی انسانی اخلاق و تمدن کی جان ہیں اس لیے کہ بغیر اس کے حقیقی آزادی کا تصور ممکن نہیں۔ اقبال کے نزدیک انسان میں احساس ذات کے ساتھ عمرانی ذمے داریوں کا شعور پیدا ہوتا ہے، جن کو جانے اور برتے بغیر تار حیات بے نغمہ رہتے ہیں۔[13]

علامہ اقبال کا تمام فلسفہ اور تربیتی اصول وقواعد اسی محور کے گرد گھومتے ہیں کہ مسلمان اللہ کا نائب اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے تمام انسانیت کا پیشوا اور رہنما ہے اور یہ کہ وہ ایک عالم گیر برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اسلام کا مقصود نوعِ انسان کی وحدت ہے۔ مغرب کی قومیت پروری اور وطن پرستی نے جغرافیائی حدود کے اِدھر اور اُدھر رہنے والوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔.......... مسلمانوں نے بھی اگر اس کی تقلید کی تو وہ بھی دین سے بیگانہ ہو جائیں گے۔[۱۴]

اسرار و رموز میں وحدت ملت کے تمام اصول اسلامی احکامات کے مطابق ہیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فرد کی خودی جب ملت میں گم ہو جاتی ہے تو بڑی برکتوں کا باعث بنتی ہے اس کے لیے اقبال نے تطہیر و تکمیل کا ایک نصاب تجویز کیا ہے مثلاً یاس وحزن وخوف کا ازالہ، سوال کی ممانعت، مساوات واخوتِ بنی آدم کا عقیدہ، آئین کی اطاعت، آرزو کی تربیت اور سب سے آخر میں عشق اور ضبط نفس۔ تا آنکہ فرد نیابت الٰہی تک پہنچ جاتا ہے۔[۱۵]

علامہ اقبال نے یہ فلسفہ اس وقت پیش کیا جب یورپ میں سرمایہ داریت، فسطائیت، اشتراکیت، قومیت و وطنیت کی بحثیں ہو رہی تھیں اور انسانیت جنگ وجدل کی دلدل میں پھنسی حیران و پریشان تھی چونکہ ان تمام ازموں کی بنیاد مادیت پر تھی جبکہ علامہ اقبال نے بقول ڈاکٹر عبدالسلام ندوی:

اپنے فلسفہ بے خودی کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر ان تمام جھگڑوں کو ختم کرنا چاہا ہے...... افراد کا یہ روحانی ربط ایک ایسی ملت پیدا کر دیتا ہے جس کے حدود قوم ونسل، رنگ ونسب، یا وطن کی رائج الوقت اصطلاحوں سے متعین نہیں ہوتے بلکہ روحانی افکار وخیالات سے اس کی حد بندی ہوتی ہے۔[۱۶]

علامہ اقبال کی مثنویاں (اسرار و رموز) جن نظریات کو پیش کرتی ہیں ان کی بنیاد قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ ہے۔ ان کا مقصد ملت اسلامیہ کے افراد واقوام میں اعتماد پیدا کرنا ہے تاکہ دنیا اسلام کے ثمرات سے فیض یاب ہو سکے۔ محمد حنیف شاہد لکھتے ہیں:

شیخ محمد اقبال نے...... اس زمانہ انحطاط میں ملت اسلامیہ کو مثنوی اسرارِ خودی کے ذریعے پیغام عمل دیا ہے اور رموزِ بے خودی میں مژدہ حیات سنایا ہے۔[۱۷]

چونکہ علامہ اقبال کا سارا فلسفہ ہی اسلامی روح سے لبریز ہے اور ان کا اصل خطاب مسلمانوں ہی سے ہے اس لیے بقول عبدالرحمان:

اقبال کا واضح مقصد فوق البشر کی ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے جو عقل کے ذریعے عناصر پر لامحدود غلبہ واقتدار حاصل کر لے اور ساتھ ہی بوسیلہ وجدان یا تعلق باللہ خدائی مقاصد سے بھی سرشار ہو، وہی انسان اس زمین

پر خدا کی خلافت کے مستحق ہوں گے بلکہ زمین و آسمان ان کی میراث بن جائیں گے۔[۱۸]

اگر چہ علامہ اقبال نے یہ مثنویاں مسلمانوں کا لائحہ عمل متعین کرنے کی غرض سے تحریر کیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی قوم جب ان اصولوں پر عمل پیرا ہوگی تو یقیناً وہ فلاح پائے گی اور عروج حاصل کرے گی۔ اس حقیقت پر بحث کرتے ہوئے مرزا سلطان لکھتے ہیں:

ملتیں اسی حالت میں زندہ رہ سکتی ہیں جب ان کی اجتماعی خودی اور خود داری زندہ رہے۔...... جس طرح افراد سے قومیں بنتی اور ترکیب پاتی ہیں اسی طرح انفرادی خودی سے اجتماعی خودی بنتی ہے اور ہستی پذیر ہوتی ہے ان دونوں قسموں کی خودیوں سے...... قومیں اور شخصیتیں ترقی کرتی اور مدارج علیا تک پہنچتی ہیں۔[۱۹]

الغرض اس ساری تحقیق سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی مثنویاں (اسرار و رموز) کی عمارت قرآنی اصولوں پر تعمیر کی ہے اور سنت رسول ﷺ کے بیش بہا خزانے سے موتی چن کر اس کو سجایا ہے کیونکہ تمام انسانیت کی بھلائی اسی نظام اسلام میں مضمر ہے اس لیے علامہ اقبال نے اس فلسفے کو آفاقی رنگ دیا ہے۔ کیونکہ یہ صرف دین اسلام ہے جو ساری دنیا کے انسانوں کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرتا ہے پھر ان کو اخوت اور محبت کی زنجیر میں باندھ کر ایک دوسرے کا رفیق بنا دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلی مثالی اسلامی ریاست ''مدینۃ النبی ﷺ'' میں اسلام کی عملی تصویر پیش کی۔ اسرار و رموز اسی دور کی تفسیریں پیش کرتی ہیں۔ خلفائے راشدین کے دور میں خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں افراد و ملت کی تربیت انھی اصولوں پر ہوتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ خود داری و آبروئے ملت کے لیے سرفروشی کی مثالوں اور داستانوں سے بھری پڑی ہے۔

ہم مملکت خدا داد پاکستان کو اسلام کی ایک تجربہ گاہ اور اسلام کا قلعہ اسی وقت بنا سکتے ہیں جب اس کے افراد زیور خودی سے آراستہ ہوں گے۔ یہ کام پاکستان کی ہر ہر حکومت کا ہے کہ وہ اسکولوں سمیت تمام تعلیمی اداروں میں نہ صرف تعلیمات اقبال اور تعلیمات اسلام کو عام کرے بلکہ علامہ اقبال کی اسرار خودی کی روشنی میں افراد کی تعمیر سازی اور تربیت کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرے۔ افراد کی اس طرح کی تربیت سے ملت اسلامیہ کی وحدت و یگانگت، ہمدردی و تعاون باہمی کے جو تقاضے ہیں وہ پورے کرنے خود بخود آسان ہو جائیں گے۔

علامہ اقبال کی مثنویوں (اسرار و رموز) کا اصل مقصد یہی ہے کہ ملت اسلامیہ کے افراد جو ملت کے مقدر کے ستارے ہیں، خودی کی تربیت سے اپنے اندر سچی چمک اور روشنی پیدا کریں اور پھر (اجتماعی خودی کی شکل میں) مل کر ملت کے آسمان پر اس شان سے طلوع ہو جائیں کہ زمانے بھر کے اندھیرے اجالوں میں بدل جائیں اور انسانیت کو سکھ اور چین نصیب ہو سکے۔

اسلامی آفاقی وحدت کے وجود میں آنے کے اعجاز سے ان شاء اللہ باقی تمام ازم تاریکیوں کی گود میں سو جائیں گے۔ بقول پروفیسر محمد منور:

باقی سارے ازم مشق خاک بازی ہیں...... پھر کوئی وجہ نہیں کہ باطل نظریات ایک روز جھڑ نہ جائیں اور اسلام کی ہمہ جہتی مساوات اور عدالت کا دور دورہ نہ ہو، وہ مساوات و عدالت جو قرآن وسنت کی روشنی میں خلافت راشدہ نے قائم کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی تھی۔ ان شاء اللہ یہ ہو کر رہے گا[۲۰]

اور یہ اس لیے ہو کر رہے گا کہ مملکت خداداد پاکستان میں اقبال شناسی کے نئے دور کا آغاز ہو گا اور افراد و اقوام کی تربیت سے ہم زمانے میں رخشندہ آفتاب بن کر ابھریں گے۔ علامہ اقبال نے بھی باعمل مسلم فرد و قوم کو درخشاں مستقبل کا امین کہا ہے۔ فرماتے ہیں:

جہانگیری بخاک ما سرشتند
امامت در جبین ما نوشتند
درون خویش بنگراں جہاں را
کہ تخمش در دل فاروق کشتند[۲۱]

❁...❁...❁

حواشی و حوالہ جات

۱- محمد رضی الدین صدیقی، اقبال کا تصور زماں ومکاں اور دوسرے مضامین، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۳، ص ۶۸، ۶۹۔
۲- اقبال، کلیاتِ اقبال، اُردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۶، ص ۱۹۲۔
۳- ایضاً، ص ۲۰۹، ۲۶۰۔
۴- محمد عثمان، پروفیسر، اسرار و رموز پر ایک نظر، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۶۱، ص ۳۶-۳۷۔
۵- عزیز احمد، اقبال: نئی تشکیل، کتاب خانہ تاج آفس کراچی، ص ۴۲۶۔
۶- حسن اختر ملک، اطراف اقبال، مکتبہ میری لائبریری لاہور، ۱۹۷۲، ص ۱۳۶۔
۷- نعیم صدیقی، (مدیر اعلیٰ) مجلّہ ماہنامہ سیارہ، اقبال نمبر ۱۹۹۲، لاہور۔
۸- اقبال، محمد، اسرار و رموز، شیخ غلام اینڈ سنز ۱۹۸۵، ص ۵۰۔
۹- سید عبداللہ، ڈاکٹر، متعلقات خطبات اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷، ص ۱۴، ۱۵۔
۱۰- محمد جلیل نقوی، مطالعۂ اقبال، علمی کتب خانہ لاہور، ص ۵۹۔
۱۱- اقبال، بانگِ درا، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۶، ص ۲۴۸۔

۱۲- ایضاً، ص ۱۹۱۔
۱۳- یوسف حسین خان، روح اقبال، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۶۵، ص ۲۰۹۔
۱۴- خلیفہ عبدالحکیم، فکرِ اقبال، بزم اقبال کلب روڈ ۱۹۸۳، ص ۵۴۰۔
۱۵- سید عبداللہ، مسائل اقبال، مغربی پاکستان اردو اکادمی ۱۹۷۴، ص ۱۵۔
۱۶- عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، مکتبہ ادب اردو لاہور، ۱۹۶۷، ص ۲۸۳۔
۱۷- محمد حنیف شاہد، نذر اقبال، بزم اقبال ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۷۲، ص ۲۱۔
۱۸- بزم اقبال (مرتبہ)، فلسفہ اقبال، بزم اقبال لاہور ۱۹۸۴، ص ۳۱۴۔
۱۹- گوہر نوشاہی (مرتب)، مطالعہ اقبال، بزم اقبال ۲ کلب روڈ لاہور ۱۹۸۳، ص ۴۳۴۔
۲۰- محمد منور، ایقان اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۴، ص ۱۶۵۔
۲۱- اقبال، ارمغانِ حجاز، (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۵، ص ۹۰۔